محمد حنیف ندوی

ایک آیت

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ٥ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ٥

ان لوگوں کی کہاوت اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔ پھر جب اس کا گرد و پیش جگمگا اٹھا تو اللہ نے آنکھ کی روشنی ہی چھین لی۔ اور اندھیروں میں پڑا رہنے دیا۔ اب ان کی یہ حالت ہے کہ کوئی بات سمجھائی نہیں دیتی۔ بہرے، گونگے اور اندھے ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی طرف پلٹ آنے کی کوئی اُمید نہیں۔

یوں تو ان دو آیتوں میں نحو و ادب کی کئی بحثیں سمٹ آئی ہیں۔ مگر سردست ان میں جو تمثیل کا استعمال ہوا ہے اس کی اہمیت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ قرآن میں اس کا استعمال کتنا برمحل ہے۔

سورہ عنکبوت میں شرک سے متعلق اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے کہ اس سے زیادہ بودا اور کھوکھلا سہارا اور کوئی نہیں ہو سکتا، فرمایا کہ:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتخذوا من دون الله اولياء كمثل العنكبوت۔

ان لوگوں کی کیفیت جنھوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز ٹھہرایا اس ڈھنگ کی ہے جیسے مکڑی کا گھر۔ کہ ہوا کے جھونکے یا بارش کے ایک ہی چھینٹے سے ختم ہو جائے۔

اس آیت میں مشرک کی بیچارگی کی جتنی عمدہ تصویر اللہ تعالیٰ نے کھینچی ہے اس سے زیادہ قطعی ممکن نہیں۔ اس کے بعد فرمایا: وَمَا يعقلها الا العالمون: یعنی ان تمثیلات پر غور و فکر کی توفیق صرف انہی لوگوں کو عطا ہوئی جو عالم ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ منجملہ علوم قرآنی کے تمثیل کا علم بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور مخصوص فہم کا متقاضی ہے۔ غور کیجئے گا اور ان تمثیلات کا محلِ استعمال دیکھئے گا تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے تین طرح کے متعین کام لئے ہیں:

(۱) وضاحت و تفصیل کا۔ (۲) طنز کا۔ (۳) دلیل کا۔

وضاحت کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ جو لوگ اللہ کی رضاجوئی کی غرض سے روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ اللہ ان کے مال و دولت میں برکت دیتا ہے۔ اس کو یوں ادا کیا گیا ہے:-

مثل الذين ينفقون اموالهم فى سبيل الله كمثل حَبَّةٍ انبتت سبع سنابل

فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم (بقرۃ)

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک دانہ کی سی ہے۔ جس سے سات بالیں پیدا ہوئیں

اور ہر بال میں سو سو دانہ اُگا۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے برکت دیتا ہے اللہ بڑی گنجائش والا اور عالم ہے۔

پھر جب ان لوگوں کا تذکرہ کرنا چاہا جو دکھاوے کا خرچ کرتے ہیں اور ان کی نیت ہرگز یہ نہیں ہوتی، کہ اللہ تعالیٰ اس خیرات سے خوش ہو۔ تو ان کی یہ کوشش کیونکر رائگاں جاتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے:۔

فمثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہٗ وابل فترکہ صلدا۔

ایسے آدمی کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے چٹان پر بیج بکھیر دیا۔ پھر جب زور کی بارش آئی تو اس کو صاف کر گئی

طنز میں وضاحت بھی ہوتی ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب دلائل سے متاثر نہیں ہوتا اور منطق اس کی کبر و نخوت کی دبیز تہوں کو چاک نہیں کر پاتی تو طنز کے ایک ہی وار سے اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور بڑائی کا طول و عرض معلوم ہو جاتا ہے۔ یہودیوں کے علم و فضل کی تاریخ اگرچہ قدیم تھی۔ یعنی ان کے ہاں اس وقت بھی مدارس و مکاتب کا چرچا تھا۔ جب عرب امیت پر قانع تھے اور اس وقت بھی صحائف موسیٰ کے جاننے والے ان میں بہت تھے۔ جب دوسری قومیں اس معاملہ میں ان کی ہمسر نہیں ہو سکتی تھیں۔ تاہم ان کی محرومیوں کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہی لوگ تھے جنہوں نے ان کوششوں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اور اسلام کی دعوت پر مطلق کان نہ دھرا۔ توراۃ چونکہ متعدد صحیفوں سے تعبیر ہے۔ اس میں تاریخ بھی ہے انبیاء کے حالات بھی مختلف قوموں کے عروج و زوال کی داستان بھی ادب کے عملی نمونے بھی ہیں اور عقائد و اخلاق کی تفصیلات بھی۔ اس لئے جب ان میں کے بڑے بڑے علمانے قرآن کو وہ اہمیت نہ دی جس کا وُہ مستحق تھا۔ تو سوال یہ پیدا ہوا کہ ایسی الہامی کتاب کی داد تو درحقیقت یہ یہودی ہی دے سکتے تھے۔ جن کو پہلے سے صحائف انبیاء کا ذوق و تجربہ تھا۔ اور جو جانتے تھے کہ انبیاء کی تبلیغ و اشاعت کا کیا ڈھنگ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے نوشتوں کا کیا اندازہ ہوتا ہے۔ عرب کے ان پڑھ کیا جانیں کہ قرآن کی عظمت کس احترام کا مطالبہ کرتی ہے۔ پھر جب یہی خاموش ہیں بلکہ غیر مطمئن ہیں تو اس کی جلالت قدر کی حقیقت معلوم!

اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا جواب دیا۔ کہ یہودیوں نے کتابوں کا پشتارہ تو بلا شبہ اپنے پر لاد رکھا ہے۔ لیکن ان سے کوئی فائدہ بھی اُٹھایا ہے یا انہیں یہی چیز جاننے کی ہے:۔

مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا۔

ان لوگوں کی مثال جن پر توراۃ لادی گئی لیکن اُنھوں نے اسے انگیز نہ کیا ایسی ہے جیسے گدھا۔ جو بہت سی کتابیں اُٹھائے مگر اس سے اُس کے علم میں اضافہ نہیں ہوتا۔

یہودیوں کی ایک بیماری یہ بھی تھی کہ وُہ کسی حال پر قانع نہیں تھے۔ جب ہدایت کی فراوانیاں تھیں۔ اس وقت بھی بر حرف بز تھے۔ پھر جب دین و دنیا کی برکتیں ان سے چھین لی گئیں اس وقت بھی یہ شاکی تھے۔ ان کی اس بے اطمینانی کیفیت کو ایک تمثیل

کے رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ دیکھئے کتنا کامیاب طنز ہے:

واتل علیھم نبأ الذی اتینٰہ اٰیتنا فانسلخ منھا فاتبعہ الشیطان فکان من الغٰوین۔ ولو شئنا لرفعنٰہ بھا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث ذٰلک مثل القوم الذین کذبوا باٰیٰتنا (اعراف)

ان کو اُس شخص کا قصہ سناؤ جس کو اپنی رنگ برنگ کی نشانیوں سے نوازا۔ مگر اُس نے اس خلعت کو اتار پھینکا اور شیطان اس کے پیچھے ہو لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گمراہ ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے تو اس کے رتبہ کو بڑھاتے لیکن اس نے خود زمین میں دھنسنے کو پسند کیا۔ اس کی کہاوت کتے کی سی ہے۔ تم اس کو چھیڑو تو جب بھی زبان باہر لٹکائے رہے اور اپنی حالت پر رہنے دو جب بھی زبان باہر نکالے رہے۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنھوں نے ہماری آیتوں کے ہوتے ساتے تکذیب کی۔

دلائل کا اندازہ نپا تُلا ہے۔ ان کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ جس میں صغریٰ و کبریٰ اور حد اوسط کو مقررہ ڈھنگ سے آنا چاہئے۔ ورنہ وہ نتیجہ جس کا استنباط مقصود ہوتا ہے مشکوک ٹھہرے گا۔

قرآن حکیم نے اس منطقی ترتیب کی بالکل پروا نہیں کی۔ کیونکہ اس کے سامنے رد و قبول کے نئے ڈھنگ ہیں اور وہ وہ ہیں جو فطری ہیں یعنی قرآن جس منطق کا التزام روا رکھتا ہے۔ وہ ارسطو کی منطق نہیں بلکہ اس حکیم و علیم خدا کی منطق ہے جس نے مختلف دلوں میں پذیرائی اور اثر اندازی کے مختلف پیمانے پیدا کئے کسی شخص کو ایسا بنایا کہ وہ ٹھوس علمی استدلال ہی سے متاثر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ہے کہ جسے تاریخی حقائق کے سوا اور کوئی چیز نہیں جچتی۔ کچھ سیدھی سادھی زبان میں اوامر و نواہی کو سن لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو تشبیہ و مثال سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ دلیل کی غرض و غایت بھی اطمینان پیدا کرنا ہے اسلئے اگر ایک مثال اور تشبیہ سے — دعویٰ پوری طرح ذہن پر قابو پا لیتا ہے۔ اور ایسا نکھر جاتا ہے کہ اس سے پورا اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے۔ تو ہم اسے دلیل ہی کہیں گے۔ آپ اسے فن کی اصطلاحوں میں چاہے کچھ اور ہی قرار دیں۔ اس وضاحت کی روشنی میں آیات محولہ بالا پر غور کیجئے ان میں یہ بتایا گیا ہے، کہ کفار و منافقین کو جو توفیق ہدایت نہیں ملی، تو اس کی وجہ یہ نہیں، کہ اس چشمۂ فیض میں کوئی نقص ہے یا ارشاد و ہدایت کی شمیم انگیزیوں میں کوئی کمی روا رکھی گئی ہے بلکہ اسکی وجہ خود انکی محرومیاں ہیں۔ انھوں نے عین اس وقت آنکھوں کو بند کر لیا ہے جب اسلام کی روشنی سے ماحول پوری طرح جگمگا اٹھا ہے اور ان لمحوں میں دل و دماغ پر تعصب و انکار کی پٹیاں کس کے باندھ لی ہیں۔ جبکہ حق کے مقابلہ میں ان کو بدرجہ غایت نرم ہونا چاہئے تھا۔ گویا ان دو آیتوں میں کامیاب طنز بھی ہے اور اسلام کی معقولیت و پذیرائی پر دلیل بھی ہے اور اس بات کی وضاحت بھی ہے کہ کفار و منافقین کیوں اسلام کے برکات سے بہرہ مند نہ ہو سکے۔